غلام گردش

بیوقوف ماریہ

ماریا میگدالینا (Maria Magdalena) کا تعلق پولینڈ سے ہے۔ انتہائی زبردست کھلاڑی۔ جیولین تھرو (Javelin throw) میں ٹوکیو اولمپس میں سلور میڈل حاصل کرنے والی اس ایتھلیٹ نے ذاتی زندگی میں بہت تکلیف دیکھی ہے۔ ہڈیوں کے کینسر سے مسلسل جدوجہد کے بعد صحت یاب ہونا از حد مشکل کام ہے۔ اور اس سے بھی بڑی بات۔ موذی مرض سے ٹھیک ہونے کے بعد' کھیل کے میدان میں اولمپکس تک پہنچنا ایک خواب ہی کی تکمیل ہوسکتی ہے۔ ایسا خواب جسے عام آدمی ہرگز ہرگز پورا نہیں کرسکتا۔ ٹوکیو اولمپکس میں ماریا گولڈ میڈل حاصل نہیں کر پائی۔ اسے چاندی کا میڈل ملا۔ گولڈ میڈل حاصل کرنے والی کھلاڑی اس سے صرف دو سینٹی میٹر آگے تھی۔ ماریا جب پولینڈ واپس آئی تو پورے ملک نے اس کو خوش آمدید کہا۔ آج سے ٹھیک پانچ ماہ پہلے' ماریہ نے ایک ایسا زبردست کام کیا کہ پوری دنیا اس کی گرویدہ ہوگئی۔ اولمپکس میں حاصل ہونے والا تمغہ نیلام کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ نیلامی کے اعلان سے پوری دنیا میں کہرام مچ گیا۔ ماریا کے فیس بک صفحہ پر ان گنت پیغامات آنے شروع ہوگئے۔ کہ اپنا میڈل کیوں فروخت کررہی ہے۔ ماریہ کے ایک جملے نے تمام لوگوں کے سوالات کا ایسا خوبصورت جواب دیا کہ ان کی آنکھ میں آنسو آگئے۔ میڈل کی نیلامی سے جو رقم وصول ہوگی۔ اسے آٹھ ماہ کے انجان بچے مالوزک (Milozek) کے دل کے آپریشن کے لئے عطیہ کرونگی۔ نیلامی میں پوری دنیا سے لوگوں نے حصہ لیا۔ پولینڈ کے ایک سپر سٹور جین زیبکا (zabka) نے یہ میڈل ایک لاکھ تیس ہزار ڈالر میں خرید لیا۔ نیلامی ختم ہونے کے بعد سپر سٹور جین کا مالک' ماریا کے پاس گیا اور میڈل اسے واپس کردیا۔ الفاظ تھے کہ یہ اعزاز پولینڈ کو ملا ہے اور اسے کسی بھی قیمت پر خریدا نہیں جاسکتا۔ اور جس جذبے کا مظاہرہ ایک اجنبی بچے کے آپریشن کے لئے ماریہ نے کیا ہے' وہ بذات خود انمول ہے۔ ماریا نے تمام رقم مالوزک کے والدین کو امریکہ بھجوادی تاکہ اس غریب بچے کا کامیاب آپریشن ہوسکے۔ اور ایسے ہی ہوا۔ پوری دنیا میں ماریہ ایک بیش بہا کھلاڑی نہیں' بلکہ اس سے بھی پروقار مقام پر پہنچ گئی۔ انسایت کی فلاح و بہبود کے لئے اپنا سب کچھ قربان کردینے والی دہلیز پر' ایک ایسا رتبہ جہاں انسان حقیقت میں امر ہوجاتا ہے۔

انسان کا دوسرے انسان سے رشتہ اور تعلق وہ مضمون ہے جس پر ہر وقت بات اور کام کرنے کی ضرورت ہے۔ خدا سے ہماری وابستگی تو بہت ذاتی سطح کی ہے۔ خدا تو رحیم ہے۔ ایک ثواب پر تمام گناہ معاف کرنے کا وعدہ کرتا ہے۔ مگر ہم' ایک دوسرے کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔ یہ حد درجہ نازک مرحلہ ہے۔ اسے حقوق العباد کہہ سکتے ہیں۔ جس میں کسی قسم کی کوتاہی قابل معافی نہیں۔ اس میں لغزش تو خدا بھی معاف نہیں کرتا۔ حساسیت کا اندازہ اس امر سے لگا لیجئے۔ کہ مرنے والے کی تدفین سے پہلے اعلان ہوتا ہے کہ اگر متوفی کے ذمہ کوئی قرض ہے تو وارث موجود ہیں۔ قرض کی واپسی ان کے ذمہ ہے۔ یہ انسان سے انسان کے رویہ اور رابطہ کی صرف ایک مثال ہے۔ دنیا کے تمام ادیان میں انسانی رشتوں کے حوالے سے کافی حد تک یکسانیت ہے۔ مگر یہ میرا آج کا

موضوع نہیں ہے۔ باہمی مدد اور کمزور طبقے کی کفالت کے لحاظ سے جب اردگرد دیکھتا ہوں تو بہت زیادہ مایوسی ہوتی ہے۔ بلکہ یوں کہیے کہ ناگہانی قنوطیت میں مبتلا ہو جاتا ہوں جس سے احساس تنہائی مزید بڑھ جاتا ہے۔ ٹی وی اور میڈیا پر مختلف ادارے اور این جی اوز کی طرف سے اشتہار در اشتہار نظر آتے ہیں۔ جو انسانیت کی فلاح کے لئے ہر وقت چندہ مانگتے نظر آتے ہیں۔ سوال تو یہ اٹھتا ہے کہ جناب آپ عام آدمی کی بھلائی کا دعویٰ کرتے ہیں۔ پھر پیسے وصول کر کے میڈیا پر انہی کے پیسوں سے مزید بھلائی کے لئے رقم مانگنا' کیا حد درجہ ادنیٰ حرکت نہیں ہے۔ کیا واقعی ان لوگوں کو چندہ دینا جائز ہے جو اپنی پی آر اور دیدہ زیب اشتہاری مہم کے ذریعے صرف اور صرف آپ کی جیب پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ جن کے نرم خو لہجے کے پیچھے پیسے کمانے والا ایک ساہوکار بیٹھا نظر آتا ہے۔ جس کے سامنے ایک بہت بڑا آہنی گلہ ہے۔ ان فلاحی اداروں کے مالکان کی اکثریت بیش قیمت گاڑیوں میں سفر کرتی ہے۔ دنیا کے دیگر ممالک سے صرف اور صرف این جی اوز کی بدولت لیکچرز اور کانفرنسوں کا انعقاد کرواتی ہے۔ اپنے لئے تعریفی کلمات کہلوائے جاتے ہیں۔ جے جے کار کروائی جاتی ہے۔ یہ وزراء اعلیٰ اور وزیراعظم سے نزدیکی تعلقات رکھنے میں برتری محسوس کرتے ہیں۔ سوشل میڈیا پر ان کی ٹیم اپنے سربراہان کو فرشتہ ثابت کرنے کے لئے کوشاں نظر آتی ہے۔ اور میرے جیسے بے فہم لکھاری ان کی تعریف کرتے نظر آتے ہیں۔ آج تک ان کی منافقت کی موجودگی کو تسلیم نہیں کر پایا۔ شاید مجھ میں ہی کوئی خرابی ہے۔ ورنہ اکثر لوگ تو ان کی جھوٹی تعریف کرتے ہیں۔ سرمایہ داری نظام کے ذریعے این جی اوز اور فلاحی اداروں کے سربراہان کی اکثریت صرف اور صرف اپنی شخصیت کو ماقوف الفطرت بنانے میں مصروف ہیں۔ ان سے گفتگو کریں' تو یہ اپنی ذات کے علاوہ کوئی بات نہیں کر سکتے۔ میں نے یہ کیا' میں یہ کرنا چاہتا ہوں۔ میرے فلاں فلاں فلاحی ادارے ہیں۔ اپنی ناک سے آگے نہ دیکھ سکنے والے لوگ ہمارے سماجی نظام میں انسانیت کی خدمت کا غیر معقول دعویٰ کرتے ہیں۔ کئی افراد کا نام لے کر ذکر کر سکتا ہوں۔ مگر یہ قلم کی حرمت کے خلاف بات ہے۔

زندگی میں صرف ایک بار' عبدالستار ایدھی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ایسا نایاب انسان جس کے دم قدم سے ہمارے جیسے بدبودار نظام میں خوشبو کا دریا بہتا ہے۔ شدید گرمیوں کے دن تھے۔ ایدھی صاحب ایک کمرے میں اے سی بند کر کے پسینے سے شرابور بیٹھے ہوئے تھے۔ نیپا کی طرف سے ہم کوئی چالیس افسر تھے جو ان سے ملنے کے لئے سرکاری سطح پر موجود تھے۔ یقین فرمائیے۔ ایدھی صاحب نے پھٹے پرانے سیاہی مائل کپڑے پہن رکھے تھے۔ بتانے لگے کہ یہ کپڑے بھی ان کے نہیں ہیں۔ بلکہ یہ کسی مردہ لاش کے تھے۔ لاش کو غسل دیتے ہوئے یہ کپڑے خود رکھ لئے۔ اور مرتے دم تک یہی پہنتے رہے۔ شائد کم لوگوں کو یاد ہو کہ ایدھی صاحب کی وصیت کے مطابق انہیں کفن نہیں پہنایا گیا۔ بلکہ انہی پرانے کپڑوں میں دفن کیا گیا' جو وہ عام زندگی میں پہنتے تھے۔ ایدھی صاحب نے یہ بھی بتایا کہ آج بھی آمدورفت کے لئے وہ ایک پرانا سکوٹر استعمال کرتے ہیں۔ جس گھر میں ایدھی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ اس کے دالان میں صدقے کے ان گنت جانور بندھے ہوئے تھے۔ بتانے لگے کہ لوگوں سے بار بار درخواست

کرتے ہیں کہ اتنے جانوروں کو ذبح کر کے مستحقین تک نہیں پہنچا سکتے۔ مگر لوگ باز نہیں آتے۔ یقین فرمایئے۔ دالان میں جانوروں کی قطاریں ہی قطاریں تھیں۔ اور ایدھی صاحب لوگوں کو منع کر رہے تھے کہ صدقے کے جانور نہ لائیں۔ مگر ایدھی صاحب پر لوگوں کا اتنا اعتماد تھا کہ وہ پھر بھی انہیں عطیہ دینے سے نہیں ٹلتے تھے۔ ایدھی صاحب نے کلفٹن پر موجود اپنے دفتر کے متعلق بتایا کہ یہ دراصل ایک تاجر کا بہت عالیشان گھر تھا۔ ایک دن آیا اور ایدھی صاحب کو پورا بنگلہ حوالے کر گیا۔ شرط صرف یہ تھی کہ کسی کو اس آدمی کا نام نہیں بتانا۔ یہی وہ بنیادی کردار کا ٹھوس پن ہے جو نیک آدمی کو واقعی فرشتہ سیرت بناتا ہے۔ اس تاجر نے تقریباً ایک ارب روپے کا بنگلہ ایدھی صاحب کے حوالے کر دیا اور اس کا نام تک کوئی نہیں جانتا۔ ایدھی صاحب نے اس گھر میں ایک یتیم خانہ بنا رکھا تھا۔ ایدھی ہوم کی روایت کے مطابق گھر کے ایک کمرے کو عبادت گاہ کا درجہ دیا گیا تھا۔ جس میں بلا تخصیص مذہب' بچے اور بچیاں اپنے اپنے عقیدے کے مطابق عبادت کر سکتے تھے۔ ایدھی صاحب کی اہلیہ' بلقیس صاحبہ' یتیم خانے میں مصروف کار تھیں۔ انہوں نے بھی انتہائی سادہ سے کپڑے پہن رکھے تھے۔ ہمیں واقعی اس ظاہری اور باطنی سادگی کی اشد ضرورت ہے۔

ویسے میرا ایک جزوی سوال بھی ہے۔ اشتہاری مہم کے ذریعے فلاحی نیک نام ہونے والے لوگوں سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ اپنے ذاتی وسائل' جائیداد سے اپنے ادارے کو واقعی کتنا فیض پہنچایا ہے۔ یقین فرمایئے کہ متعدد ایسے سماجی اداکاروں کو جانتا ہوں۔ جو عالیشان گھروں میں رہتے ہیں۔ کروڑوں روپے کی گاڑیوں میں گھومتے ہیں۔ اور عام لوگوں سے سادگی اور خدمت کے نام پر چندہ مانگتے ہیں۔ ان میں سے متعدد کے عظیم الشان دفاتر بھی ہیں۔ جہاں یہ عمدہ کپڑے پہن کر انسانیت کی جعلی خدمت کی منصوبہ بندی کرتے ہیں۔ کمال یہ بھی ہے کہ یہ لوگوں کو بے وقوف بنانے میں کافی کامیاب ہیں۔ ویسے ایک خوشی تو ہے' یہ ہمارے منافق معاشرے کے لئے بالکل درست لوگ ہیں۔ ہمیں ماریہ اور ایدھی جیسی عظیم ہستیاں نہیں چاہیں جو اپنا تن من دھن لٹا کر غریب لوگوں پر وار دیں۔ اس کے برعکس ہمارے فلاحی اداروں کی اکثریت تو اپنا خبث باطن چھپا کر سونے کی اینٹوں پر کھڑے ہو کر عظیم ہونے کا عوامی اعلان کر رہے ہیں۔ اور وہ شائد کامیاب بھی ہیں۔ ماریہ جیسی بے وقوف سماجی دیوی کو ہمارے ملک کے منافق فلاحی اداروں میں زیر تربیت رہنا چاہیے۔ شائد اسے تھوڑی سی عقل آ جائے؟